نتائج

لٹریچر پیش قدمی کرتا ہے۔ رائے عام اسکے پیچھے آتی ہے۔ آخر میں اجتماعی اخلاق، سوسائیٹی کے ضوابط اور حکومت کے قوانین سب سپر ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں پیہم ڈیڑھ سو سال تک فلسفہ، تاریخ، اخلاقیات، فنونِ حکومت، ناول، ڈراما، تھیٹر، آرٹ، غرض دماغوں کو تیار کرنے والے اور ذہنوں کو ڈھالنے والے تمام آلات اپنی متحدہ طاقت کے ساتھ ایک ہی طرزِ خیال کو انسانی ذہن کے ریشہ ریشہ میں پیوست کرتے رہیں وہاں اس طرزِ خیال سے سوسائیٹی کا متاثر نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ پھر جس جگہ حکومت اور ساری اجتماعی تنظیمات کی بنیاد جمہوری اصولوں پر ہو وہاں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ رائے عام کی تبدیلی کے ساتھ قوانین میں تغیر نہ ہو۔

صنعتی انقلاب اور اسکے اثرات اتفاق یہ کہ عین وقت پر دوسرے تمدنی اسباب بھی سازگار ہو گئے۔ اسی زمانہ میں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) رونما ہوا۔ اس سے معاشی زندگی میں جو تغیرات واقع ہوئے، اور تمدنی زندگی پر اُن سے جو اثرات مترتب ہوئے وہ سب کے سب حالات کا رُخ اسی سمت میں پھیر دینے کے لیے تیار تھے جدھر یہ انقلابی لٹریچر انہیں پھیرنا چاہتا تھا۔ شخصی آزادی کے جس تصور پر نظام سرمایہ داری کی تعمیر ہوئی تھی اسکو مشین کی ایجاد اور کثیر پیدا آوری (Mass production) کے امکانات نے غیر معمولی قوت بہم پہنچادی۔ سرمایہ دار طبقوں نے بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی ادارے قائم کیے۔ صنعت و تجارت کے نئے مرکز رفتہ رفتہ عظیم الشان شہر بن گئے۔ دیہات و مفصلات سے لاکھوں کروروں انسان کھنچ کھنچ کر ان شہروں میں جمع ہوتے چلے گئے۔ زندگی حد سے زیادہ گراں ہو گئی۔ مکان، لباس، غذا، اور تمام ضروریاتِ زندگی پر آگ برسنے لگی۔ کچھ ترقی تمدن

کے سبب سے اور کچھ سرمایہ داروں کی کوششوں سے بے شمار نئے اسبابِ عیش بھی زندگی کی ضروریات میں داخل ہو گئے۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام نے دولت کی تقسیم اِس طرز پر نہیں کی کہ جن آسائشوں اور لذتوں اور آرائشوں کو اس نے زندگی کی ضروریات میں داخل کیا تھا انہیں حاصل کرنے کے وسائل بھی اسی پیمانہ پر سب لوگوں کو بہم پہنچاتا۔ اس نے تو عوام کو اتنے وسائل معیشت بھی بہم نہ پہنچائے کہ جن بڑے بڑے شہروں میں وہ ان کو گھسیٹ لایا تھا، وہاں کم از کم زندگی کی حقیقی ضروریات —— مکان، غذا اور لباس وغیرہ —— ہی انکو بآسانی حاصل ہو سکتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہر پر بیوی، اور باپ پر اولاد تک بارِ گراں بن گئی۔ ہر شخص کے لیے خود اپنے آپ ہی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا کجا کہ وہ دوسرے متعلقین کا بوجھ اٹھائے۔ معاشی حالات نے مجبور کر دیا کہ ہر فرد کمانے والا فرد بن جائے۔ کنواری اور شادی شدہ اور بیوہ سب ہی قسم کی عورتوں کو رفتہ رفتہ کسب رزق کے لیے نکل آنا پڑا۔ پھر جب دونوں صنفوں میں ربط و اختلاط کے مواقع زیادہ بڑھے اور اسکے فطری نتائج ظاہر ہونے لگے تو اسی شخصی آزادی کے تصور اور اسی نئے فلسفۂ اخلاق نے آگے بڑھ کر باپوں اور بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں، شوہروں اور بیویوں، سب کو اطمینان دلایا کہ کچھ گھبرانے کی بات نہیں، جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے، یہ گراوٹ نہیں اٹھان (emancipation) ہے، یہ بداخلاقی نہیں عین لطفِ زندگی ہے، یہ گڑھا جس میں سرمایہ دار تمہیں پھینک رہا ہے دوزخ نہیں جنت ہے جنت!

سرمایہ دارانہ خود غرضی اور معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ حریتِ شخصی کے اِس تصور پر جس نظام سرمایہ داری کی بنا اٹھائی گئی تھی اس نے فرد کو ہر ممکن طریقہ سے دولت کمانے کا غیر مشروط اور غیر محدود اجازت نامہ دیدیا، اور نئے فلسفۂ اخلاق نے ہر اس طریقہ کو حلال و طیّب ٹھیرایا جس سے دولت کمائی جاسکتی ہو، خواہ ایک شخص کی دولت مندی کتنے ہی اشخاص کی تباہی کا نتیجہ ہو۔ اس طرح تمدن کا سارا نظام ایسے طریقہ پر بنا کہ جماعت کے مقابلہ میں ہر پہلو سے فرد کی حمایت تھی اور فرد کی خود غرضیوں کے مقابلہ میں جماعت کے لیے تحفظ کی

کوئی صورت نہ تھی۔ خود غرض افراد کے لیے سوسائیٹی پر تاخت کرنے کے سارے راستے کھل گئے۔ انہوں نے تمام انسانی کمزوریوں کو چن چن کر تاکا، اور انہیں اپنی اغراض کے لیے استعمال (exploit) کرنے کے نت نئے طریقے اختیار کرنے شروع کیے۔ ایک شخص اٹھتا ہے اور وہ اپنی جیب بھرنے کے لیے لوگوں کو شراب نوشی کی لعنت میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے۔ کوئی نہیں جو سوسائیٹی کو اس طاعون کے چوہے سے بچائے۔ دوسرا اٹھتا ہے اور وہ سود خواری کا جال دنیا بھر میں پھیلا دیتا ہے۔ کوئی نہیں جو اس جونک سے لوگوں کے خونِ حیات کی حفاظت کرے ــــ بلکہ سارے قوانین اسی جونک کے مفاد کی حفاظت کر رہے ہیں تاکہ کوئی اس سے ایک قطرۂ خون بھی نہ بچا سکے ــــ تیسرا اٹھتا ہے اور وہ قمار بازی کے عجیب عجیب طریقے رائج کرتا ہے، حتی کہ تجارت کے بھی کسی شعبہ کو قمار کے عنصر سے خالی نہیں چھوڑتا۔ کوئی نہیں جو اس تپ محرقہ سے انسان کی حیاتِ معاشی کا تحفظ کرے۔ انفرادی خودسری اور لغی و عدوان کے اس ناپاک دور میں غیر ممکن تھا کہ خود غرض افراد کی نظر انسان کی اس بڑی اور شدید ترین کمزوری ــــ شہوانیت ــــ پر نہ پڑتی جس کو بھڑکا کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس سے بھی کام لیا گیا اور اتنا کام لیا گیا جتنا لینا ممکن تھا۔ تھیٹروں میں، رقص گاہوں میں، اور فلم سازی کے مرکزوں میں سارے کاروبار کا مدار ہی اس پر قرار پایا کہ خوبصورت سے خوبصورت عورتوں کی خدمات حاصل کی جائیں، انکو زیادہ سے زیادہ برہنہ اور زیادہ سے زیادہ ہیجان انگیز صورت میں منظرِ عام پر پیش کیا جائے، اور اس طرح لوگوں کی شہوانی پیاس کو زیادہ سے زیادہ بھڑکا کر انکی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ کچھ دوسرے لوگوں نے عورتوں کو کرایہ پر چلانے کا انتظام کیا اور قحبہ گری کے پیشہ کو ترقی دیکر ایک نہایت منظم بین الاقوامی تجارت کی حد تک پہنچا دیا۔ کچھ اور لوگوں نے زینت و آرائش کے عجیب عجیب سامان نکالے اور انکو خوب پھیلایا تاکہ عورتوں کے پیدائشی جذبۂ حسن آرائی کو بڑھا کر دیوانگی تک پہنچا دیں اور اس طرح دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹیں۔ کچھ اور لوگوں نے لباس کے نئے شہوت انگیز اور عریاں فیشن نکالے، اور خوبصورت عورتوں کو اسلیے مقرر کیا کہ وہ انہیں پہن کر سوسائیٹی میں پھریں، تاکہ نوجوان مرد کثرت سے انکی طرف راغب ہوں، اور نوجوان لڑکیوں میں ان لباسوں

کے پہننے کا شوق پیدا ہو اور اس طرح موجد لباس کی تجارت فروغ پائے۔ کچھ اور لوگوں نے برہنہ تصویروں اور فحش مضامین کی اشاعت کو روپیہ کھینچنے کا ذریعہ بنایا اور اس طرح عوام کو اخلاقی جذام میں مبتلا کر کے خود اپنی جیبیں بھرنی شروع کیں۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشکل ہی سے تجارت کا کوئی شعبہ ایسا باقی رہ گیا ہو جس میں شہوانیت کا عنصر شامل نہ ہو۔ کسی تجارتی کاروبار کے اشتہار کو دیکھ لیجیے۔ عورت کی برہنہ یا نیم برہنہ تصویر اس کا جزو لاینفک ہوگی۔ گویا عورت کے بغیر اب کوئی اشتہار اشتہار ہی نہیں ہو سکتا۔ ہوٹل، ریسٹراں، شوروم، کوئی جگہ آپ کو ایسی نہ ملیگی جہاں عورت اس غرض سے نہ رکھی گئی ہو کہ مرد اسکی طرف کھنچ کر آئیں۔ غریب سوسائٹی جس کا کوئی محافظ نہیں، صرف ایک ہی ذریعہ سے اپنے مفاد کی حفاظت کر سکتی تھی کہ خود اپنے اخلاقی تصورات سے ان حملوں کی مدافعت کرتی اور اس شہوانیت کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دیتی۔ مگر نظام سرمایہ داری ایسی کچی بنیادوں پر نہیں اٹھا تھا کہ یوں اسکے حملہ کو رد کیا جا سکتا۔ اسکے ساتھ ایک مکمل فلسفہ اور ایک زبردست شیطانی لشکر ——— لٹریچر بھی تو تھا جو ساتھ ساتھ اخلاقی نظریات کی شکست و ریخت بھی کرتا جا رہا تھا۔ قاتل کا کمال یہی ہے کہ جسے قتل کرنے جائے اسکو بطوع و رغبت قتل ہونے کے لیے تیار کر دے۔

جمہوری نظام سیاست مصیبت اتنے پر بھی ختم نہ ہوئی۔ مزید براں، اسی تصور آزادی نے مغرب میں جمہوری نظام حکمرانی کو جنم دیا جو اس اخلاقی انقلاب کی تکمیل کا ایک طاقتور ذریعہ بن گیا۔

جمہوریت جدیدہ کا اصل الاصول یہ ہے کہ لوگ خود اپنے حاکم اور خود اپنے قانون ساز ہیں، جیسے قوانین چاہیں اپنے لیے بنائیں اور جن قوانین کو پسند نہ کریں ان میں جیسی چاہیں ترمیم و تنسیخ کر دیں۔ ان کے اوپر کوئی ایسا بالاتر اقتدار نہیں جو انسانی کمزوریوں سے پاک ہو اور جسکی ہدایت و رہنمائی کے آگے سر جھکا کر انسان بے راہ روی سے بچ سکتا ہو۔ ان کے لیے کوئی ایسا اساسی قانون نہیں جو اٹل ہو اور انسان کی دست رس سے باہر ہو اور جسکے اصولوں کو ناقابل ترمیم و تنسیخ مانا جائے۔ ان کے لیے کوئی ایسا معیار نہیں جو صحیح اور غلط کی تمیز کے لیے کسوٹی ہو اور انسانی اہواء اور خواہشات کے ساتھ بدلنے والا نہ ہو بلکہ ثابت اور مستقل ہو۔ اس طرح جمہوریت کے جدید نظریہ

نے انسان کو بالکل خود مختار اور غیر ذمہ دار فرض کر کے آپ ہی اپنا شارع بنادیا اور ہر قسم کی قانون سازی کا مدار صرف رائے عام پر رکھا۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جہاں اجتماعی زندگی کے سارے قوانین رائے عام کے تابع ہوں، اور جہاں حکومت اسی جمہوریت جدیدہ کے الٰہ کی عبد ہو، وہاں قانون اور سیاست کی طاقتیں کسی طرح سوسائٹی کو اخلاقی فساد سے نہیں بچا سکتیں، بلکہ بچانا کیا معنی، آخر کار وہ خود اس کو تباہ کرنے میں معین و مددگار بن کر رہینگی۔ رائے عام کے ہر تغیر کے ساتھ قانون بھی بدلتا چلا جائیگا۔ جوں جوں عام لوگوں کے نظریات بدلینگے، قانون کے اصول اور ضوابط بھی انکے مطابق ڈھلتے جائینگے۔ حق اور خیر اور صلاح کا کوئی معیار اسکے سوا نہ ہوگا کہ ووٹ کس طرف زیادہ ہیں۔ ایک تجویز، خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی ناپاک کیوں نہ ہو، اگر عوام میں اتنی قبولیت حاصل کر چکی ہے کہ ۱۰۰ میں سے ۵۱ ووٹ حاصل کر سکتی ہے، تو اسکو تجویز کے مرتبہ سے ترقی کر کے شریعت بنجانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اسکی بدترین عبرت انگیز مثال وہ ہے جو نازی دور سے پہلے جرمنی میں ظاہر ہوئی۔ جرمنی میں، ایک صاحب ڈاکٹر ماگنوس ہرشفیلڈ (Magnus Hirschfeld) ہیں جو دنیا کی مجلس اصلاح صنفی (World League of Sexual Reform) کے صدر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے عمل قوم لوط کے حق میں چھ سال تک زبردست پروپیگنڈا کیا۔ آخر کار جمہوریت کا الٰہ اس حرام کو حلال کر دینے پر راضی ہو گیا اور جرمن پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے طے کر دیا کہ اب یہ فعل جرم نہیں ہے بشرطیکہ طرفین کی رضامندی سے اس کا ارتکاب کیا جائے، اور معمول کے نابالغ ہونے کی صورت میں اسکا ولی ایجاب و قبول کی رسم ادا کر دے!

قانون اس جمہوری الٰہ کی عبادت میں ذرا نسبتہً سست کار واقع ہوا ہے۔ اُسکے اوامر کا اتباع کرتا تو ہے مگر کسل اور کاہلی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ نقص جو عبودیت کی تکمیل میں باقی رہ گیا ہے، اسکی کسر حکومت کے انتظامی کل پُرزے پوری کر دیتے ہیں۔ جو لوگ اِن جمہوری حکومتوں کے کاروبار چلاتے ہیں وہ قانون سے پہلے اس لٹریچر اور اُن اخلاقی فلسفوں کا، اور اُن عام رجحانات کا اثر قبول کر لیتے ہیں جو ان کے گرد و پیش پھیلے ہوئے ہوتے ہیں،

انکی عنایت سے بیہودہ بداخلاقی سرکاری طور پر تسلیم کرلی جاتی ہے جبکا رواج عام ہوگیا ہو - جو چیزیں قانوناً ابھی تک ممنوع ہیں ان کے معاملہ میں عملاً پولیس اور عدالتیں قانون کے نفاذ سے احتراز کرتی ہیں اور اس طرح وہ گویا حلال کے درجے میں ہو جاتی ہیں - مثال کے طور پر اسقاط ہی کو لے لیجیے جو مغربی قوانین میں اب بھی حرام ہے مگر کوئی ملک ایسا نہیں جہاں علی الاعلان اور بکثرت اس کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو - انگلستان میں کم سے کم اندازہ کے مطابق ہر سال ۹۰ ہزار حمل اسقاط کیے جاتے ہیں - شادی شدہ عورتوں میں سے کم از کم ۲۵ فیصدی ایسی ہیں جو یا تو خود اسقاط کرلیتی ہیں یا کسی ماہر فن کی مدد حاصل کرتی ہیں - غیر شادی شدہ عورتوں میں اس کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہے - بعض مقامات پر عملاً باقاعدہ اسقاط کلب قائم ہیں جنکو خواتین کرام ہفتہ وار فیس ادا کرتی رہتی ہیں تاکہ موقع پیش آنے پر ایک ماہر اسقاط کی خدمات آسانی سے حاصل ہو جائیں - لندن میں ایسے بہت سے نرسنگ ہوم ہیں جہاں زیادہ تر مریضات وہ ہوتی ہیں جنہوں نے اسقاط کرایا ہوتا ہے[1] - اسکے باوجود انگلستان کی کتاب آئین میں اسقاط ابھی تک جرم ہی ہے -

حقائق و شواہد اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تینوں عناصر، یعنی جدید اخلاقی نظریات، سرمایہ دارانہ نظام تمدن، اور جمہوری نظام سیاسی، مل جل کر اجتماعی اخلاق اور مرد و عورت کے صنفی تعلق کو کس طرح متاثر کر رہے ہیں اور ان سے فی الواقع کس قسم کے نتائج رونما ہوئے ہیں - چونکہ اسوقت تک میں نے زیادہ تر سرزمین فرانس کا ذکر کیا ہے جہاں سے اس تحریک کا آغاز ہوا تھا، لہذا میں سب سے پہلے فرانس ہی کو شہادت میں پیش کرونگا[2] -

اخلاقی حس کا تعطل پچھلے باب میں جن نظریات کا ذکر کیا جا چکا ہے انکی اشاعت کا اولین اثر یہ ہوا کہ صنفی معاملات میں لوگوں کی اخلاقی حس مفلوج ہونے لگی - شرم و حیا اور غیرت و حمیت روز بروز مفقود ہوتی چلی گئی -

---

[1] یہ تفصیلات پروفیسر جوڈ نے اپنی کتاب (Guide to Modern Wickedness) میں بیان کی ہیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے -

[2] میں نے زیادہ تر ان معلومات کا استفادہ ایک ممتاز فرانسیسی عالم عمرانیات پول بیورو (Paul Bureau) کی کتاب (Towards Moral Bankruptcy) سے کیا ہے جو ۱۹۲۵ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے -

نکاح و سفاح کی تمیز دلوں سے نکل گئی، اور زنا ایک ایسی معصوم چیز بن گئی جسے اب کوئی عیب یا قباحت کی بات سمجھا ہی نہیں جاتا کہ اس کو چھپانے کا اہتمام کیا جائے۔

انیسویں صدی کے وسط بلکہ اخیر تک عام فرانسیسیوں کے اخلاقی نظریہ میں صرف اتنا تغیر ہوا تھا کہ مردوں کے لیے زنا کو بالکل ایک معمولی، فطری چیز سمجھا جاتا تھا، والدین اپنے نوجوان لڑکوں کی آوارگی کو (بشرطیکہ وہ امراض خبیثہ یا کسی عدالتی کارروائی کی موجب نہ بن جائے) بخوشی گوارا کرتے تھے، بلکہ اگر وہ مادّی حیثیت سے مفید ہو تو اس پر خوش بھی ہوتے تھے، اور ان کے خیال میں کسی مرد کا کسی عورت سے نکاح کے بغیر تعلق رکھنا کوئی معیوب فعل نہ تھا۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ والدین نے اپنے نوجوان لڑکوں پر خود زور دیا ہے کہ کسی با اثر یا مالدار عورت سے تعلقات قائم کر کے اپنا مستقبل درخشاں بنائیں۔ لیکن اس وقت تک عورت کے معاملہ میں نظریہ اس سے بہت مختلف تھا۔ عورت کی عصمت بہر حال ایک قیمتی چیز سمجھی جاتی تھی۔ وہی والدین جو اپنے لڑکے کی آوارگی کو جوانی کی ترنگ سمجھ کر گوارا کر لیتے تھے، اپنی لڑکی کے دامن پر کوئی داغ دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ بدکار مرد جس طرح بے عیب سمجھا جاتا تھا، بدکار عورت اُس طرح بے عیب سمجھی جاتی تھی۔ پیشہ ور فاحشہ کا ذکر جس ذلت کے ساتھ کیا جاتا تھا، اس کے پاس جانے والے مرد کے حصہ میں وہ ذلت نہ آتی تھی۔ اسی طرح ازدواجی رشتے میں بھی عورت اور مرد کی اخلاقی ذمہ داری مساوی نہ تھی۔ شوہر کی بدکاری گوارا کر لی جاتی تھی مگر بیوی کی بدکاری ایک سخت چیز تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز تک پہنچتے پہنچتے یہ صورت حال بدل گئی۔ تحریک آزادیٔ نسواں نے عورت اور مرد کی اخلاقی مساوات کا جو صور پھونکا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ عام طور پر عورت کی بدکاری کو بھی اسی طرح غیر معیوب سمجھنے لگے جس طرح مرد کی بدکاری کو سمجھتے تھے، اور نکاح کے بغیر کسی مرد سے تعلق رکھنا عورت کے لیے بھی کوئی ایسا فعل نہ رہا جس سے اس کی شرافت و عزت پر بٹہ لگتا ہو۔ پول بیورو لکھتا ہے:

"نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ فرانس کے قصبات و دیہات تک میں اب نوجوان مرد اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب ہم عفیف نہیں ہیں تو ہمیں اپنی منگیتر سے بھی عفت کا مطالبہ کرنے کا، اور یہ چاہنے

کا کہ وہ کہیں کنواری ملے، کوئی حق نہیں ہے۔ برگنڈی، یون اور دوسرے علاقوں میں اب یہ عام بات ہے کہ ایک لڑکی شادی سے پہلے بہت سی "دوستیاں" کر چکی ہے اور شادی کے وقت اسے اپنے منگیتر سے اپنی گذشتہ زندگی کے حالات چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ لڑکی کے قریب ترین رشتہ داروں میں بھی اسکی بدچلنی پر کسی قسم کی ناپسندیدگی نہیں پائی جاتی۔ وہ اسکی "دوستیوں" کا ذکر آپس میں اس طرح بے تکلفانہ کرتے ہیں گویا کسی کھیل یا روزگار کا ذکر ہے۔ اور نکاح کے موقع پر دولہا صاحب، جو اپنی دلہن کی سابق زندگی ہی سے نہیں بلکہ اُس کے اُن "دوستوں" تک سے واقف ہوتے ہیں جو اب تک اس کے جسم سے لطف اٹھاتے رہے ہیں، اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو اس بات کا شبہ تک نہ ہونے پائے کہ انہیں اپنی دلہن کے ان مشاغل پر کسی درجہ میں بھی کوئی اعتراض ہے۔" (صفحہ ۹۴)

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"فرانس میں متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ صورت حال بکثرت دیکھی جاتی ہے، اور اب اس میں قطعاً کوئی غیر معمولی پن نہیں رہا ہے کہ ایک اچھے خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی، جو کسی دفتر یا تجارتی فرم میں ایک اچھی جگہ پر کام کرتی ہے، اور شائستہ سوسائٹی میں اٹھتی بیٹھتی ہے، کسی نوجوان سے مانوس ہوگئی اور اسکے ساتھ رہنے لگی۔ اب یہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ شادی کریں۔ دونوں شادی کے بغیر ہی ایک ساتھ رہنا زیادہ مرجح سمجھتے ہیں، محض اسلیے کہ دونوں کو دل بھر جانے کے بعد الگ ہو جانے اور کہیں اور دل لگانے کی آزادی حاصل رہے۔ سوسائٹی میں انکے تعلق کی یہ نوعیت سب کو معلوم ہوتی ہے۔ شائستہ طبقوں میں دونوں مل کر آتے جاتے ہیں۔ نہ وہ خود اپنے تعلق کو چھپاتے ہیں، نہ کوئی دوسرا انکی ایسی زندگی میں کسی قسم کی برائی محسوس کرتا ہے۔ ابتدا میں یہ طرزِ عمل کارخانوں میں کام کرنے والے لوگوں نے شروع کیا تھا۔ اول اول اسکو سخت معیوب سمجھا گیا۔ مگر اب یہ اونچے طبقوں میں عام ہو گیا ہے اور اجتماعی زندگی میں اس نے وہی حیثیت حاصل کر لی ہے جو کبھی نکاح کی تھی۔" (صفحہ ۹۴ - ۹۶)

اس نوعیت کی داشتہ کو اب باقاعدہ تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ موسیو برتلیمی (M. Berthelemy)
پیرس یونیورسٹی کا معلم قانون لکھتا ہے کہ رفتہ رفتہ "داشتہ" کو وہی قانونی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے جو پہلے "بیوی" کی تھی۔ پارلیمنٹ میں اسکا تذکرہ آنے لگا ہے۔ حکومت اسکے مفاد کی حفاظت کرنے لگی ہے ایک سپاہی کی داشتہ کو وہی نفقہ دیا جاتا ہے جو اسکی بیوی کے لیے مقرر ہے۔ سپاہی اگر مر جائے تو اسکی داشتہ کو وہی پنشن ملتی ہے جو منکوحہ بیوی کو ملتی ہے۔

فرانسیسی اخلاقیات میں زنا کے غیر معیوب ہونے کی کیفیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں ایک مدرسہ کی معلمہ مس ہونے کے باوجود حاملہ پائی گئی۔ محکمہ تعلیم میں کچھ پرانے خیال کے لوگ بھی موجود تھے۔ انہوں نے ذرا شور مچایا۔ اس پر معززین کا ایک وفد وزارت تعلیم میں حاضر ہوا اور اسکے حسب ذیل دلائل اتنے وزنی پائے گئے کہ معلمہ کا معاملہ رفع دفع کر دیا گیا:

(۱) کسی کی پرائیویٹ زندگی سے لوگوں کو کیا مطلب؟

(۲) اور پھر اس نے آخر کس جرم کا ارتکاب کیا ہے؟

(۳) اور کیا نکاح کے بغیر ماں بننا زیادہ جمہوری طریقہ نہیں ہے؟

فرانسیسی فوج میں سپاہیوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں من جملہ دوسرے ضروری مسائل کے یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ امراض خبیثہ سے محفوظ رہنے اور حمل روکنے کی کیا تدابیر ہیں۔ گویا یہ بات تو مسلم ہی ہے کہ ہر سپاہی زنا ضرور کریگا۔ ۲ مئی ۱۹۱۹ء کو فرانس کی ۱۲۷ ویں ڈویژن کے کمانڈر نے سپاہیوں کے نام ایک اعلان عام شائع کیا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

"معلوم ہوا ہے کہ فوجی قحبہ خانوں پر بندوقچیوں کے ہجوم کی وجہ سے عام سوار اور پیادہ فوج کے سپاہیوں کو شکایت ہے۔ وہ گلہ کرتے ہیں کہ بندوقچیوں نے ان جگہوں پر اپنا اجارہ قائم کر لیا ہے اور وہ دوسروں کو موقع ہی نہیں دیتے۔ ہائی کمانڈ کوشش کر رہا ہے کہ عورتوں کی تعداد میں کافی اضافہ کر دیا جائے، مگر جب تک

یہ انتظام نہیں ہوتا، بندوقچیوں کو ہدایت ...... کی جاتی ہے کہ زیادہ دیر تک اندر نہ رہا کریں اور اپنی خواہشات کی تسکین میں ذرا عجلت سے کام لیا کریں"۔

غور تو کیجیے۔ یہ اعلان دنیا کی ایک مہذب ترین حکومت کے فوجی محکمہ کی طرف سے باضابطہ سرکاری طور پر شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زنا کے اخلاقاً معیوب ہونے کا وہم تک ان لوگوں کے دل و دماغ میں باقی نہیں رہا ہے۔ سوسائٹی، قانون، حکومت سب کے سب اس تصور سے خالی ہو چکے ہیں[1]۔

جنگِ عظیم سے کچھ مدت پہلے فرانس میں ایک ایجنسی اس اصول پر قائم کی گئی تھی کہ ہر عورت خواہ وہ اپنے حالات، ماحول، مالی کیفیت اور عادی اخلاقی چال چلن کے اعتبار سے کیسی ہی ہو، بہر حال "ایک نئے تجربہ" کے لیے آمادہ کی جا سکتی ہے۔ جو صاحب کسی خاتون سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہوں وہ بس اتنی زحمت اٹھائیں کہ ان لیڈی صاحبہ کا اتا پتا بتا دیں اور ۲۵ فرانک ابتدائی فیس کے طور پر داخل کر دیں۔ اس کے بعد صاحبہ موصوفہ کو معاملہ پر راضی کر لینا ایجنسی کا کام ہے۔ اس ایجنسی کے رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ فرنچ سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس کے کثیر التعداد لوگوں نے اس سے "بزنس" نہ کیا ہو، اور یہ کاروبار حکومت سے بھی مخفی نہ تھا۔ (پول بیورو۔ صفحہ ۱۶)

اس اخلاقی زوال کی انتہا یہ ہے کہ:

"فرانس کے بعض اضلاع میں اور بڑے شہروں کی گھنی آبادی رکھنے والے حصوں میں قریب ترین نسبی

---

[1] جس فوج کی یہ اخلاقی حالت ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ کسی دوسرے ملک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہو گی تو اس کے ہاتھوں مغلوب قوم کی عزت و آبرو پر کیا کچھ نہ گزر جاتی ہو گی۔ سپاہیانہ اخلاق کا ایک معیار یہ ہے اور دوسرا معیار وہ ہے جو قرآن پیش کرتا ہے کہ الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ ایک وہ سپاہی ہے جو زمین میں سانڈ بنا پھرتا ہے۔ اور ایک سپاہی وہ ہے جو اس لیے سر ہتھیلی پر لیکر نکلتا ہے کہ انسانی اخلاق کی حفاظت کرے اور دنیا کو پاکیزگی کا سبق سکھائے۔ کیا انسان اتنا اندھا ہو گیا ہے کہ دونوں کا فرق نہیں دیکھ سکتا؟

رشتہ داروں کے درمیان، حتیٰ کہ باپ اور بیٹی اور بھائی اور بہن تک کے درمیان صنفی تعلقات کا پایا جانا، اب کوئی شاذ و نادر واقعہ نہیں رہا ہے۔"

فواحش کی کثرت | جنگ عظیم سے چند سال پہلے موسیو بیولو (M. Bulot) فرانس کے اٹارنی جنرل نے اپنی رپورٹ میں اُن عورتوں کی تعداد ۵ لاکھ بتائی تھی جو اپنے جسم کو کرایہ پر چلاتی ہیں۔ مگر وہاں کی زنان بازاری کو ہندوستان کی پیشہ ور فاحشات پر قیاس نہ کر لیجیے۔ شائستہ اور متمدن ملک ہے۔ اسکے سب کام شائستگی، تنظیم اور فی الجملہ بلند پیمانے پر ہوتے ہیں۔ وہاں اس پیشہ میں فن اشتہار سے پورا کام لیا جاتا ہے۔ اخبار، مصور پوسٹ کارڈ، ٹیلیفون، اور شخصی دعوت نامے، اغرض تمام مہذب طریقے گاہکوں کی توجہ منعطف کرانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اور پبلک کا ضمیر اس پر کوئی ملامت نہیں کرتا۔ بلکہ اس تجارت میں جن عورتوں کو زیادہ کامیابی نصیب ہو جاتی ہے وہ بسا اوقات ملکی سیاسیات اور رمالیات میں اور اعیان و امرا کے طبقوں میں کافی با اقتدار ہو جاتی ہیں۔ وہی ترقی جو کبھی یونانی تمدن میں اس طبقہ کی عورتوں کو نصیب ہوئی تھی!

فرینچ سنیٹ کے ایک رکن موسیو فردناں دریفو (M. Ferdinand Dreyfus) نے اب سے چند سال پہلے بیان کیا تھا کہ قحبہ گری کا پیشہ اب محض ایک انفرادی کام نہیں رہا ہے، بلکہ اسکی ایجنسی سے جو عظیم مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں انکی وجہ سے اب یہ ایک تجارت (Business) اور ایک منظم حرفہ (Organised Industry) بن گیا ہے۔ اس کے "خام پیداوار" مہیا کرنے والے ایجنٹ الگ ہیں، سفری ایجنٹ الگ ہیں۔ اسکی باقاعدہ منڈیاں موجود ہیں۔ جوان لڑکیاں اور کمسن بچیاں وہ تجارتی مال ہیں جسکی درآمد اور برآمد ہوتی ہے، اور دس سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ ہے۔

پول بیورو لکھتا ہے :-

"یہ ایک زبردست نظام ہے جو پورے منضبط طریقے سے تنخواہ یاب عہدہ داروں اور کارکنوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ناشرین اور اہل قلم (Publicists) خطبا و مقررین، اطبا اور

قابلات (Midwives) اور تجارتی سیاح اس میں باقاعدہ ملازم ہیں، اور اشتہار اور مظاہرہ کے جدید ترین طریقے اسکے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔"

فحش کاری کے ان اڈوں کے ماسوا ہوٹلوں اور رقص خانوں اور رقص خانوں میں علی الاعلان قحبہ گری کا کاروبار ہو رہا ہے، اور بعض اوقات بہیمیت انتہائی ظلم اور قساوت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں ایک مرتبہ مشرقی فرانس کے ایک میر بلدیہ (Mayor) کو مداخلت کر کے ایک ایسی لڑکی کی جاں بخشی کرانی پڑی تھی جسکو دن بھر میں ۵۷ گاہکوں سے پالا پڑ چکا تھا اور ابھی مزید گاہک تیار کھڑے تھے۔

تجارتی قحبہ خانوں کے علاوہ "خیراتی قحبہ خانوں" کی ایک نئی قسم پیدا کرنے کا شرف جنگ عظیم کو حاصل ہوا۔ جنگ کے زمانہ میں جن محب وطن خواتین نے سرزمین فرانس کی حفاظت کرنے والے بہادروں کی "خدمت" فرمائی تھی، اور جنکو اس خدمت کے صلہ میں بے باپ کے بچے مل گئے تھے، انہیں (War-godmothers) کا معزز لقب عطا ہوا ــــ یہ ایسا اچھوتا تخیل ہے کہ اردو زبان اسکا ترجمہ کرنے سے عاجز ہے ــــ یہ خواتین منظم صورت میں قحبہ گری کرنے لگیں اور انکی "امداد" کرنا سپاہ کاروں کے لیے ایک اخلاقی کام بن گیا۔ بڑے بڑے روزانہ اخباروں اور خصوصاً فرانس کے دو مشہور مصور جریدوں فنتا سیو (Fantasio) اور لاوی پاریزیاں (La Vie Parisienne) نے ان کی طرف "مردان کار" کی توجہ جلب کرانے کی خدمت سب سے بڑھکر انجام دی۔ ۱۹۱۵ء کے آغاز میں موخر الذکر اخبار کا صرف ایک نمبر ان عورتوں کے ۱۹۹ اشتہارات پر مشتمل تھا۔

شہوانیت اور بے حیائی کی وبا، فواحش کی یہ کثرت اور مقبولیت شہوانی جذبات کے جس اشتعال کا نتیجہ ہے وہ لٹریچر، تصاویر، سینما، تھیٹر، رقص، اور برہنگی و بے حیائی کے عام مظاہروں سے رونما ہوتا ہے۔

خود غرض سرمایہ داروں کا ایک پورا لشکر ہے جو ہر ممکن تدبیر سے عوام کی شہوانی پیاس کو بھڑکانے میں لگا ہوا ہے اور اس ذریعہ سے اپنے کاروبار کو فروغ دے رہا ہے۔ روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات،

مصور جرائد اور نصف ماہی اور ماہوار رسالے انتہا درجہ کے فحش مضامین اور شرمناک تصویریں شائع کرتے ہیں کیونکہ اشاعت بڑھانے کا یہ سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے، اور اس کام میں اعلیٰ درجہ کی فصاحت، فن کاری، اور نفسیات کی مہارت صرف کی جاتی ہے تاکہ شکار کسی طرف سے بچ کر نہ جاسکے۔ ان کے علاوہ صنفی مسائل پر حد درجہ ناپاک لٹریچر پمفلٹوں اور کتابوں کی شکل میں نکلتا رہتا ہے، جنکی کثرت اشاعت کا یہ حال ہے کہ ایک ایک ایڈیشن پچاس پچاس ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے اور بسا اوقات ساٹھ ساٹھ ایڈیشنوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ بعض اشاعت خانے تو صرف اسی لٹریچر کی اشاعت کے لیے مخصوص ہیں۔ بہت سے اہل قلم ایسے ہیں جو اسی ذریعہ سے شہرت اور عزت کے مرتبے پر پہنچے ہیں۔ اب کسی فحش کتاب کا لکھنا کسی کے لیے بے عزتی نہیں ہے، بلکہ اگر کتاب مقبول ہو جائے تو ایسے مصنفین فرنچ اکیڈمی کے ممبر یا کم از کم "کروے دانیور" (Croix dihonneur) کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

حکومت ان تمام بے شرمیوں اور ہیجان انگیزیوں کو ٹھنڈے دل سے دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی بہت ہی زیادہ شرمناک چیز شائع ہوگئی تو پولیس نے با دل ناخواستہ چالان کر دیا۔ مگر اوپر فراخ دل عدالتیں بیٹھی ہیں جنکی بارگاہ عدل سے اس قسم کے مجرموں کو صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ عدالت کی کرسیوں پر جلوہ فرما ہوتے ہیں ان میں سے اکثر خود اس لٹریچر سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں، اور بعض حکام عدالت کا اپنا قلم فحش صنفی لٹریچر کی تصنیف سے آلودہ ہوتا ہے۔ اتفاقاً اگر کوئی مجسٹریٹ دقیانوسی خیال کا نکل آیا اور اس سے "بے انصافی" کا اندیشہ ہوا تو بڑے بڑے ادیب اور نامور اہل قلم بالاتفاق اس معاملہ میں مداخلت کرتے ہیں، اور زور شور سے اخبارات میں لکھا جاتا ہے کہ آرٹ اور لٹریچر کی ترقی کے لیے آزاد فضا درکار ہے، قرون مظلمہ کی سی ذہنیت کے ساتھ اخلاقی بندشیں لگانے کے معنی تو یہ ہیں کہ فنون لطیفہ کا گلا گھونٹ دیا جائے!

اور یہ فنون لطیفہ کی ترقی ہو رہی کس کس طرح ہے؟ اس میں ایک بڑا حصہ اُن ننگی تصویروں اور

"عملی تصویروں" کا ہے جنکے البم لاکھوں کی تعداد میں تیار کیے جاتے ہیں اور نہ صرف بازاروں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں، بلکہ مدرسوں اور کالجوں تک میں پھیلائے جاتے ہیں۔ امیل پورسیی (Emile Pourcisy) نے "جمعیت انسداد فواحش" کے دوسرے اجلاس عام میں جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں وہ لکھتا ہے :-

"یہ گندے فوٹوگراف لوگوں کے حواس میں شدید ہیجان واختلال برپا کرتے ہیں اور اپنے بدقسمت خریداروں کو ایسے ایسے جرائم پر اکساتے ہیں جنکے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں پر ان کا تباہ کن اثر حدِ بیان سے زیادہ ہے۔ بہت سے مدرسے اور کالج انہی کی بدولت اخلاقی اور جسمانی حیثیت سے برباد ہو چکے ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے لیے تو کوئی چیز اس سے زیادہ خارتگر نہیں ہو سکتی۔"

اور انہی فنونِ لطیفہ کی خدمت تھیٹر، سینما، میوزک ہال اور قہوہ خانوں کی تفریحات کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔ وہ ڈرامے جنکی تمثیل کو فرنچ سوسائیٹی کے اونچے سے اونچے طبقے دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں اور جنکے مصنفین اور کامیاب نقالوں پر تحسین وآفرین کے پھول نچھاور کیے جاتے ہیں، بلا استثنا سب کے سب شہوانیت اور بے قید بے لگام شہوانیت سے لبریز ہیں، اور انکی نمایاں خصوصیت بس یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے جو کیرکٹر بدترین ہو سکتا ہے اُسکو اُن میں مثلِ اعلیٰ اور اسوۂ حسنہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ پول بیورو کے بقول، "تیس چالیس سال سے ہمارے ڈراما نگار زندگی کے جو نقشے پیش کر رہے ہیں انکو دیکھ کر اگر کوئی شخص ہماری تمدنی زندگی کا اندازہ لگانا چاہے تو وہ بس یہ سمجھے گا کہ ہماری سوسائیٹی میں جتنے شادی شدہ جوڑے ہیں سب خائن اور ازدواجی وفاداری سے عاری ہیں، شوہر یا بیوقوف ہوتا ہے یا بیوی کے لیے بلائے جان، اور بیوی کی بہترین صفت اگر کوئی ہے تو وہ یہ کہ ہر وقت شوہر سے دل برداشتہ ہونے اور اِدھر اُدھر دل لگانے کے لیے تیار رہے۔"

اونچی سوسائٹی کے تھیٹروں کا جب یہ حال ہے تو عوام کے تھیٹروں اور تفریح گاہوں کا جو کچھ رنگ ہوگا اس کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ بدترین آوارہ منش لوگ جس زبان، جن اداؤں، اور جن عریانیوں سے مطمئن ہو سکتے ہیں وہ بغیر کسی شرم و حیا اور رلاگ لپیٹ کے وہاں پیش کر دی جاتی ہیں، اور عوام کو اشتہارات کے ذریعہ سے یقین دلایا جاتا ہے کہ تمہاری شہوانی پیاس جو جو کچھ مانگتی ہے وہ سب یہاں حاضر ہے "ہمارا اسٹیج تکلف سے خالی اور حقیقت پر مبنی (Realistic) ہے"۔ امیل پوریسی نے اپنی رپورٹ میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو مختلف تفریح گاہوں میں گشت لگا کر جمع کی گئی تھیں۔ ناموں کو اس نے حروف تہجی کے پردے میں چھپا دیا ہے:۔

"ب میں ایکٹریس کے گیت، تکلمات (Monologues) اور حرکات انتہا درجہ کے فحش تھے، اور پردوں پر جو پس منظر پیش کیا گیا تھا وہ بس صنفی اختلاط کے آخری مدارج تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ ایک ہزار سے زیادہ تماشائی موجود تھے، جن میں شرفا بھی نظر آتے تھے، اور سب عالم بے خودی میں صدائے آفرین و مرحبا بلند کر رہے تھے۔

"ن میں چھوٹے چھوٹے گیت، اور انکے درمیان مختصر تکلمات، اور انکے ساتھ حرکات و سکنات، بے شرمی کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، بچے اور کمسن نوجوان اپنے والدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس تماشہ کو دیکھ رہے تھے اور پرجوش طریقے سے ہر شدید بے شرمی پر تالیاں بجاتے تھے۔

"ل میں حاضرین کے ہجوم نے پانچ مرتبہ شور مچا کر ایک ایسی ایکٹریس کو اعادہ پر مجبور کیا جو اپنے ایکٹ کو ایک حد درجہ فحش گیت پر ختم کرتی تھی۔

"س میں حاضرین نے ایک ایکٹریس سے بار بار فرمائش کر کے ایک نہایت فحش چیز کا اعادہ کرایا۔ آخر اس نے بگڑ کر کہا "تم کتنے بے شرم لوگ ہو، دیکھتے نہیں ہو کہ ہال میں بچے بھی موجود ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ ایکٹ پورا کیے بغیر ہٹ گئی۔ چیز اتنی فحش تھی کہ وہ عادی مجرمہ بھی اسکی تکرار کو برداشت نہ کرسکتی تھی۔

"تماشا میں تماشا ختم ہونے کے بعد ایکٹرسوں پر لاٹری ڈالی گئی۔ لاٹری کے ٹکٹ خود ایکٹرسیں دس دس سانتیم[1] میں فروخت کر رہی تھیں۔ جس شخص کے نام جو ایکٹرس نکل آئی وہ اس رات کے لیے اسکی تھی۔"

پول بیورو لکھتا ہے کہ بسا اوقات اسٹیج پر بالکل برہنہ عورتیں تک پیش کر دی جاتی ہیں جنکے جسم پر کپڑے کے نام کا ایک تار بھی نہیں ہوتا۔ اوولف بریساں (Adolphe Brisson) نے ایک مرتبہ فرانس کے مشہور اخبار "طان" (Temps) میں ان چیزوں پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اب بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ اسٹیج پر فعل مباشرت کا منظر پیش کر دیا جائے" اور سچ یہ ہے کہ "آرٹ" کی تکمیل تب ہی ہو گی!

منع حمل کی تحریک اور صنفیات (Sexual Science) کے نام نہاد علمی اور طبی لٹریچر نے بھی بے حیائی پھیلانے اور لوگوں کے اخلاق بگاڑنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ پبلک جلسوں میں تقریروں اور میجک لینٹرن کے ذریعہ سے، اور مطبوعات میں تصاویر اور تشریحی بیانات کے ذریعہ سے حمل اور اسکے متعلقات اور مانع حمل آلات کے طریق استعمال کی وہ وہ تفصیلات بیان کی جاتی ہیں جنکے بعد کوئی چیز قابلِ اظہار باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح صنفیات کی کتابوں میں تشریح بدن سے لیکر ـــــ آخر تک معاملات صنفی کے کسی پہلو کو بھی روشنی میں لائے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ بظاہر ان سب چیزوں پر علم اور سائنس کا غلاف چڑھا دیا گیا ہے تاکہ یہ اعتراض سے بالاتر ہو جائیں۔ بلکہ مزید ترقی کر کے ان چیزوں کی اشاعت کو "خدمتِ خلق" کے نام سے بھی موسوم کر دیا جاتا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہم تو لوگوں کو صنفی معاملات میں غلطیاں کرنے سے بچانا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس لٹریچر اور اس تعلیم کی عام اشاعت نے عورتوں، مردوں، اور کمسن نوجوانوں میں سخت بے حیائی پیدا کر دی ہے۔ اسکی بدولت آج یہ نوبت آگئی ہے کہ ایک نوخیز لڑکی جو مدرسے میں تعلیم پاتی ہے اور ابھی سنِ بلوغ کو بھی پوری طرح نہیں پہنچی ہے، صنفی معاملات کے متعلق وہ معلومات رکھتی ہے جو کبھی شادی شدہ عورتوں کو بھی حاصل نہ تھیں۔ اور یہی حال نوخیز بلکہ نابالغ لڑکوں کا بھی ہے۔ ان کے جذبات قبل از وقت بیدار ہو

[1] تقریباً دو آنے۔

جاتے ہیں۔ ان میں صنفی تجربات کا شوق پیدا ہو جاتا ہے پوری جوانی کو پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے آپ کو خواہشات نفسانی کے چنگل میں دے دیتے ہیں۔ نکاح کے لیے تو عمر کی حد مقرر کی گئی ہے، مگر ان تجربات کے لیے کوئی حد مقرر نہیں۔ بارہ تیرہ سال کی عمر ہی سے انکا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

قومی ہلاکت کے آثار | جہاں بداخلاقی، نفس پرستی اور لذات جسمانی کی بندگی اس حد کو پہنچ چکی ہو، جہاں عورت، مرد، جوان، بوڑھے اسب کے سب عیش کوشی میں اس قدر منہمک ہو گئے ہوں، اور جہاں انسان کو شہوانیت کے انتہائی اشتعال نے یوں آپے سے باہر کر دیا ہو، ایسی جگہ اُن تمام اسباب کا بروئے کار آجانا بالکل ایک طبعی امر ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے موجب ہوتے ہیں۔ لوگ اس قسم کی برسر انحطاط، علیٰ شفا حفرۃ من النار قوموں کو برسر عروج دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ انکی عیش پرستی انکی ترقی میں مانع نہیں ہے بلکہ الٹی مددگار ہے، اور یہ کہ ایک قوم کے انتہائی عروج و ترقی کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب وہ لذت پرستی کے انتہائی مرتبہ پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک سراسر غلط استنتاج ہے۔ جہاں تعمیر اور تخریب کی قوتیں ملی جلی کام کر رہی ہوں، اور مجموعی حیثیت سے تعمیر کا پہلو نمایاں نظر آتا ہو، وہاں تخریبی قوتوں کو بھی اسباب تعمیر میں شمار کر لینا صرف اس شخص کا کام ہو سکتا ہے جسکی عقل خبط ہو گئی ہو۔

مثال کے طور پر اگر ایک ہوشیار تاجر اپنی ذہانت، محنت، اور آزمودہ کاری کے سبب سے لاکھوں روپیہ کما رہا ہے، اور اسکے ساتھ وہ مے نوشی، قمار بازی اور عیاشی میں بھی مبتلا ہو گیا ہے، تو آپ کتنی بڑی غلطی کرینگے اگر اسکی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو اسکی خوشحالی و ترقی کے اسباب میں شمار کر لینگے۔ دراصل اسکی صفات کا پہلا مجموعہ اسکی تعمیر کا موجب ہے، اور دوسرا مجموعہ اس عمارت کی تخریب میں لگا ہوا ہے۔ پہلے مجموعہ کی طاقت سے اگر عمارت قائم ہے تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ دوسرے مجموعہ کی تخریبی طاقت اپنا اثر نہیں کر رہی ہے۔ ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو پتہ چلیگا کہ یہ تخریبی قوتیں اسکے دماغ اور جسم کی طاقتوں کو برابر کھائے جا رہی ہیں، اسکی محنت سے کمائی ہوئی دولت پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں، اور اسکو بتدریج تباہ کرنے

کے ساتھ ساتھ ہر وقت اس تاک میں لگی ہوئی ہیں کہ کب ایک فیصلہ کن حملہ کا موقع ملے اور یہ ایک ہی وار میں اس کا خاتمہ کردیں۔ قمار بازی کا شیطان کسی بری گھڑی میں اسکی عمر بھر کی کمائی کو ایک سکنڈ میں غارت کر سکتا ہے اور وہ اس گھڑی کا منتظر بیٹھا ہے۔ مے نوشی کا شیطان وقت آنے پر اسے عالم مدہوشی میں ایسی غلطی کرا سکتا ہے جو یکلخت اسے دیوالیہ بنا کر چھوڑ دے، اور وہ بھی گھات میں لگا ہوا ہے۔ بدکاری کا شیطان بھی اُس گھڑی کا انتظار کر رہا ہے جب وہ اسے قتل یا خودکشی یا کسی اور اچانک تباہی میں مبتلا کر دے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اگر وہ ان شیاطین کے چنگل میں پھنسا ہوا نہ ہوتا تو اسکی ترقی کا کیا حال ہوتا۔

ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ تعمیری قوتوں کے بل پر ترقی کرتی ہے، مگر صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے ترقی کی طرف چند ہی قدم بڑھانیکے بعد خود اپنی تخریب کے اسباب فراہم کرنے لگتی ہے۔ کچھ مدت تک تعمیری قوتیں اپنے زور میں اسے آگے بڑھائے لیے چلی جاتی ہیں، مگر اسکے ساتھ ساتھ تخریبی قوتیں اس کی زندگی کی طاقت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہتی ہیں یہاں تک کہ آخر کار اسے اتنا کھوکھلا کر کے رکھدیتی ہیں کہ ایک اچانک صدمہ اسکے قصرِ عظمت کو آن کی آن میں پیوندِ خاک کر سکتا ہے۔ یہاں مختصر طور پر ہم اُن بڑے بڑے نمایاں اسباب ہلاکت کو بیان کرینگے جو فرنچ قوم کے اس غلط نظام معاشرت نے اسکے لیے پیدا کیے ہیں۔

<u>جسمانی قوتوں کا انحطاط</u> شہوانیت کے اس تسلط کا اولین نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فرانسیسیوں کی جسمانی قوت رفتہ رفتہ جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ دائمی ہیجانات نے انکے اعصاب کمزور کر دیے ہیں۔ خواہشات کی بندگی نے ان میں ضبط اور برداشت کی طاقت کم ہی باقی چھوڑی ہے۔ اور امراض خبیثہ کی کثرت نے انکی صحت پر نہایت مہلک اثر ڈالا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے یہ کیفیت ہے کہ فرانس کے فوجی حکام کو مجبوراً ہر چند سال کے بعد نئے رنگروٹوں کے لیے جسمانی اہلیت کے معیار کو گھٹا دینا پڑتا ہے، کیونکہ اہلیت کا جو معیار پہلے تھا اب اس معیار کے نوجوان قوم میں کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک معتبر پیمانہ ہے جو تھرما میٹر کی

طرح قریب قریب یقینی صحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ فرنچ قوم کی جسمانی قوتیں کتنی تیزی کے ساتھ بتدریج گھٹ رہی ہیں۔ امراض خبیثہ اس تنزل کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہیں۔ جنگِ عظیم کے ابتدائی دو سالوں میں جن سپاہیوں کو محض آتشک کی وجہ سے رخصت دیکر ہسپتالوں میں بھیجنا پڑا انکی تعداد ۷۵۰۰۰ تھی صرف ایک متوسط درجہ کی فوجی چھاؤنی میں بیک وقت ۲۴۲ سپاہی اس مرض میں مبتلا ہوئے۔ ایک طرف اُس وقت کی نزاکت کو دیکھیے کہ فرانسیسی قوم کی موت اور حیات کا فیصلہ درپیش تھا اور اسکے وجود و بقا کے لیے ایک ایک سپاہی کی جانفشانی درکار تھی، ایک ایک فرانک بیش قیمت تھا، اور وقت، قوت، وسائل، ہر چیز کی زیادہ سے زیادہ مقدار دفاع میں خرچ ہونے کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف اس قوم کے نوجوانوں کو دیکھیے کہ کتنے ہزار افراد اس عیاشی کی بدولت نہ صرف خود کئی کئی مہینوں کے لیے بیکار رہے ہو بلکہ انہوں نے اپنی قوم کی دولت اور وسائل کو بھی اس اڑے وقت میں اپنے علاج پر ضائع کرایا۔

ایک فرانسیسی ماہرفن ڈاکٹر لیریڈ (Dr. Leredde) کا بیان ہے کہ فرانس میں ہر سال صرف آتشک اور اسکے پیدا کردہ امراض کی وجہ سے ۳۰ ہزار جانیں ضائع ہوتی ہیں اور دق کے بعد یہ مرض سب سے زیادہ ہلاکتوں کا باعث ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک مرض خبیث کا حال ہے، اور امراض خبیثہ کی فہرست صرف اسی ایک مرض پر مشتمل نہیں ہے۔

خاندانی نظام کی بربادی اس بے قید شہوانیت، اور آوارہ منشی کے اس رواجِ عام نے دوسری عظیم الشان مصیبت جو فرانسیسی تمدن پر نازل کی ہے وہ خاندانی نظام کی تباہی ہے۔ خاندان کا نظام عورت اور مرد کے اُس مستقل اور پائیدار تعلق سے بنتا ہے جس کا نام نکاح ہے۔ اسی تعلق کی بدولت افراد کی زندگی میں سکون استقلال اور ثبات پیدا ہوتا ہے۔ یہی چیز انکی انفرادیت کو اجتماعیت میں تبدیل کرتی ہے اور انتشار (انارکی) کے میلانات کو دبا کر انہیں تمدن کا خادم بناتی ہے۔ اسی نظام کے دائرے میں محبت اور راست اور ایثار کی وہ پاکیزہ فضا پیدا ہوتی ہے جس میں نئی نسلیں صحیح اخلاق، صحیح تربیت اور صحیح قسم کی تعمیر سیرت

کے ساتھ پروان چڑھ سکتی ہیں۔ لیکن جہاں عورتوں اور مردوں کے ذہن سے نکاح اور اسکے مقصد کا تصور بالکل ہی نکل گیا ہو، اور جہاں صنفی تعلق کا کوئی مقصد شہوانی آگ کو بجھا لینے کے سوا لوگوں کے ذہن میں نہ ہو، اور جہاں ذواقین و ذواقات کے لشکر کے لشکر بھنوروں کی طرح پھول پھول کا رس لیتے پھرتے ہوں، وہاں یہ نظام نہ قائم ہوسکتا ہے نہ قائم رہ سکتا ہے۔ وہاں عورتوں اور مردوں میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ ازدواج کی ذمہ داریوں اور اسکے حقوق و فرائض، اور اسکے اخلاقی انضباط کا بوجھ سہار سکیں۔ ان کی اس ذہنی و اخلاقی کیفیت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہر نسل کی تربیت پہلی نسل سے بدتر ہوتی ہے۔ افراد میں خودغرضی و خودسری اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ تمدن کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ نفوس میں تلون اور سیماب وشی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ قومی سیاست اور اسکے بین الاقوامی رویہ میں بھی کوئی ٹھیراؤ باقی نہیں رہتا۔ گھر کا سکون بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے افراد کی زندگیاں تلخ اور تلخ تر ہوتی جاتی ہیں اور ایک دائمی اضطراب انکو کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔ یہ دنیوی جہنم کا عذاب ہے جسے انسان اپنی احمقانہ لذت طلبی کے جنون میں خود مول لیتا ہے۔

فرانس میں سالانہ سات آٹھ فی ہزار کا اوسط ان مردوں اور عورتوں کا ہے جو رشتۂ ازدواج کے رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ اوسط خود اتنا کم ہے کہ اسے دیکھ کر آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آبادی کا کتنا کثیر حصہ غیر شادی شدہ ہے۔ پھر اتنی قلیل تعداد جو نکاح کرتی ہے ان میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں جو باعصمت رہنے اور پاک اخلاقی زندگی بسر کرنے کی نیت سے نکاح کرتے ہیں۔ اس ایک مقصد کے سوا ہر دوسرا ممکن مقصد انکے پیش نظر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ عامۃ الورود مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نکاح سے پہلے ایک عورت نے جو بچہ ناجائز طور پر جنا ہے، نکاح کرکے اسکو مولود جائز بنا دیا جائے۔ چنانچہ پول بیورو لکھتا ہے کہ فرانس کے کام پیشہ لوگوں (Working Classes) میں یہ عام دستور ہے کہ نکاح سے پہلے عورت اپنے ہونے والے شوہر سے اس بات کا وعدہ لے لیتی ہے کہ وہ اسکے بچہ کو اپنا بچہ تسلیم کریگا۔ ۱۹۱۷ء میں سین (Seine) کی عدالتِ دیوانی کے سامنے ایک عورت نے

بیان دیا کہ "میں نے شادی کے وقت ہی اپنے شوہر کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ اس شادی سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے قبل از نکاح آزادانہ تعلق سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں انکو "حلالی" بنا دیا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں اسکے ساتھ بیوی بنکر زندگی گذاروں، تو یہ نہ اس وقت میرے ذہن میں تھی نہ اب ہے۔ اسی بنا پر جس روز شادی ہوئی .... اسی روز ساڑھے پانچ بجے میں اپنے شوہر سے الگ ہوگئی اور آج تک اس سے نہیں ملی کیونکہ میں فرائض زوجیت ادا کرنے کی کوئی نیت نہ رکھتی تھی۔" (صفحہ ۵۵)

پیرس کے ایک مشہور کالج کے پرنسپل نے پول بیورو سے بیان کیا کہ "عموماً نوجوان نکاح میں صرف یہ مقصد پیش نظر رکھتے ہیں کہ گھر پر بھی ایک داشتہ کی خدمات حاصل کریں۔ دس بارہ سال تک وہ ہر طرف آزادانہ مزے چکھتے پھرتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ اس قسم کی بے ضابطہ آوارہ زندگی سے تھک کر وہ ایک عورت سے شادی کر لیتے ہیں تاکہ گھر کی آسائش بھی کسی حد تک بہم پہنچے اور آزادانہ ذوّاقی کا لطف بھی حاصل کیا جاتا رہے۔" (صفحہ ۵۶)

فرانس میں شادی شدہ اشخاص کا زناکار ہونا قطعاً کوئی معیوب یا قابل ملامت فعل نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے علاوہ کوئی مستقل داشتہ رکھتا ہو تو وہ اسے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا، اور سوسائٹی اس فعل کو بالکل ایک معمولی اور متوقع بات سمجھتی ہے (صفحہ ۷۶-۷۷)

ان حالات میں نکاح کا رشتہ اس قدر بودا ہو کر رہ گیا ہے کہ بات بات میں ٹوٹ جاتا ہے۔ بسا اوقات اس بیچارے کی عمر چند گھنٹوں سے متجاوز نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرانس کے ایک ایسے معزز شخص نے جو کئی مرتبہ وزیر رہ چکا تھا، اپنی شادی کے صرف پانچ گھنٹہ بعد اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرلی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں طلاق کی موجب بن جاتی ہیں جنہیں سن کر ہنسی آتی ہے۔ مثلاً فریقین میں سے کسی ایک کا سوتے میں خرّانٹے لینا، یا کتے کو پسند نہ کرنا! اسپین کی عدالت دیوانی نے ایک مرتبہ صرف

ایک تاریخ میں ۲۹۴ نکاح فسخ کیے ۱۸۸۴ء میں جب طلاق کا نیا قانون پاس ہوا تھا، چار ہزار طلاق واقع ہوئے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں یہ تعداد ساڑھے سات ہزار تک پہنچی۔ ۱۹۱۳ء میں ۱۶ ہزار۔ اور ۱۹۳۱ء میں ۲۱ ہزار۔

نسل کُشی | بچوں کی پرورش ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی کام ہے جو ضبطِ نفس، خواہشات کی قربانی، تکلیفوں اور محنتوں کی برداشت اور جان و مال کا ایثار چاہتا ہے۔ خود غرض، نفس پرست لوگ جن پر انفرادیت اور بہیمیت کا پورا پورا تسلط ہو چکا ہو، اس خدمت کی انجام دہی کے لیے کسی طرح راضی نہیں ہو سکتے۔

ساٹھ ستر برس سے فرانس میں منع حمل کی تحریک کا زبردست پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ اس تحریک کی بدولت سرزمین فرانس کے ایک ایک مرد اور ایک ایک عورت تک ان تدابیر کا علم پہنچا دیا گیا ہے جن سے آدمی اس قابل ہو سکتا ہے کہ صنفی تعلق اور اسکی لذات سے متمتع ہونے کے باوجود اس فعل کے قدرتی نتیجہ یعنی استقرار حمل اور تولید نسل سے بچ سکے۔ کوئی شہر، قصبہ یا گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں مانع حمل دوائیں اور آلات برسرِ عام فروخت نہ ہوتے ہوں اور ہر شخص انکو حاصل نہ کر سکتا ہو۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ آزاد شہوت رانی کرنے والے لوگ ہی نہیں، بلکہ شادی شدہ جوڑے بھی کثرت سے ان تدبیروں کو استعمال کرتے ہیں، اور ہر زن و مرد کی یہ خواہش ہے کہ ان کے درمیان بچہ، یعنی وہ بلا جو تمام لطف و لذت کو کرکرا کر دیتی ہے، کسی طرح خلل انداز نہ ہونے پائے۔ فرانس کی شرح پیدائش جس رفتار سے گھٹ رہی ہے اسکو دیکھ ماہرین فن نے اندازہ لگایا ہے کہ منع حمل کی اس وبائے عام کی بدولت کم از کم ۲ لاکھ انسانوں کی پیدائش ہر سال روک دی جاتی ہے۔

ان تدابیر کے باوجود جو حمل ٹھہر جاتے ہیں انکو اسقاط کے ذریعہ سے ضائع کیا جاتا ہے، اور اس طرح مزید تین چار لاکھ انسان دنیا میں آنے سے روک دیے جاتے ہیں۔ اسقاط حمل صرف غیر شادی عورتیں ہی نہیں کراتیں بلکہ شادی شدہ بھی اس معاملہ میں انکی ہم پلہ ہیں۔ اخلاقاً اس فعل کو

ناقابلِ اعتراض، بلکہ عورت کا حق سمجھا جاتا ہے۔ قانون نے اسکی طرف سے گویا آنکھیں بند کرلی ہیں اگرچہ کتاب آئین میں یہ فعل ابھی تک جرم ہے، لیکن عملاً یہ حال ہے کہ ۳۰۰۰ میں سے بمشکل ایک کے چالان کی نوبت آتی ہے، اور پھر جن کا چالان ہوتا ہے اُن میں سے بھی ۷۵ فی صدی عدالت میں جاکر چھوٹ جاتے ہیں۔ اسقاط کی طبی تدابیر اتنی آسان اور اس قدر معلوم عوام کردی گئی ہیں کہ اکثر عورتیں خود ہی استقاط کرلیتی ہیں۔ اور جو نہیں کرسکتیں انہیں طبی امداد حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ پیٹ کے بچے کو ہلاک کردینا ان لوگوں کے لیے بالکل ایسا ہوگیا ہے جیسے کسی درد کرنے والے دانت کو نکلوا دینا!

اس ذہنیت نے فطرت مادری کو اتنا مسخ کردیا ہے کہ وہ ماں جس کی محبت کو دنیا ہمیشہ سے محبت کا بلند ترین منتہیٰ سمجھتی رہی ہے، آج اپنی اولاد سے بیزار، متنفر، بلکہ اسکی دشمن ہوگئی ہے۔ منع حمل اور اسقاط سے بچ بچا کر بھی جو بچے دنیا میں آجاتے ہیں انکے ساتھ بھی سخت بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس دردناک حقیقت کو پول بیورو نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "آئے دن اخبارات میں اُن بچوں کے مصائب کی اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں جن پر ان کے ماں باپ سخت سے سخت ظلم ڈھاتے ہیں۔ اخباروں میں تو صرف غیر معمولی واقعات ہی کا تذکرہ آتا ہے۔ مگر لوگ واقف ہیں کہ عموماً ان بچوں —— ناخواندہ مہمانوں —— کے ساتھ کیسا بے رحمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے جن سے انکے والدین صرف اسلیے دل برداشتہ ہیں کہ ان کمبختوں نے آکر زندگی کا سارا لطف غارت کردیا۔ جرأت کی کمی اسقاط میں مانع ہوجاتی ہے اور اس طرح ان معصوموں کو آنے کا موقع مل جاتا ہے، مگر جب یہ آجاتے ہیں تو انہیں اس کی پوری سزا بھگتنی پڑتی ہے۔" (صفحہ ۷۴)

یہ بیزاری اور نفرت یہاں تک پہنچی ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت کا چھ مہینہ کا بچہ مرگیا تو وہ اسکی لاش

کو سامنے رکھ کر خوشی کے مارے ناچی اور گائی، اور اپنے ہمسایوں سے کہتی پھری کہ "اب ہم دوسرا بچہ نہ ہونے دینگے۔ مجھے اور میرے شوہر کو اس بچے کی موت سے بڑا اطمینان حاصل ہوا۔ دیکھو تو سہی ایک بچہ کیا چیز ہوتا ہے۔ ہر وقت روں روں کرتا رہتا ہے، گندگی پھیلاتا ہے، اور آدمی کو کبھی اس سے نجات نصیب نہیں ہوتی" (صفحہ ۵۰)

اس سے بھی زیادہ دردناک بات یہ ہے کہ بچوں کو قتل کرنے کی وبا تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور فرانسیسی حکومت اور اسکی عدالتیں استقاط حمل کی طرح اس جرم عظیم کے معاملہ میں بھی کمال درجہ کا تغافل برت رہی ہیں۔ مثلاً فروری ۱۹۱۱ء میں لوار (Loire) کی عدالت کے سامنے دو لڑکیاں اپنے بچوں کے قتل کے الزام میں پیش ہوئیں اور دونوں بری کر دی گئیں۔ ان میں سے ایک لڑکی نے اپنے بچے کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا تھا۔ اسکے ایک بچے کو اسکے رشتہ دار پہلے سے پرورش کر رہے تھے اور اس دوسرے بچے کو بھی وہ پرورش کرنے کے لیے آمادہ تھے، مگر اس نے پھر بھی یہی فیصلہ کیا کہ اس غریب کو جیتا نہ چھوڑے۔ عدالت کی رائے میں اس کا جرم قابلِ معافی تھا۔ دوسری لڑکی نے اپنے بچے کو گلا گھونٹ کر مارا اور جب گلا گھونٹنے پر بھی اس میں کچھ جان باقی رہ گئی تو دیوار پر مار کر اسکا سر پھوڑ دیا۔ یہ عورت بھی فرانسیسی ججوں اور جیوری کی نگاہ میں جرم قتل کی سزاوار نہ ٹھیری۔ اسی سنہ کے ماہ مارچ میں سین کی عدالت کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوئی جس نے اپنے بچے کی زبان حلق سے کھینچنے کی کوشش کی، پھر اسکا سر پھوڑا اور آخر میں اسکا گلا کاٹ ڈالا۔ یہ عورت بھی جج اور جیوری، کسی کی رائے میں مجرمہ نہ تھی۔

جو قوم اپنی نسل کی دشمنی میں اس حد کو پہنچ جائے اسے دنیا کی کوئی تدبیر فنا ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ نئی نسلوں کی پیدائش ایک قوم کے وجود کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی نسل کی دشمن ہے تو دراصل وہ آپ اپنی دشمن ہے، خودکشی کر رہی ہے، کوئی بیرونی دشمن

نہ ہو تب بھی وہ آپ ہی اپنی ہستی کو مٹا دینے کے لیے کافی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں فرانس کی شرح پیدائش گذشتہ ۶۰ سال سے پیہم گرتی جا رہی ہے۔ کسی سال شرح اموات شرح پیدائش سے بڑھ جاتی ہے، کسی سال دونوں تقریباً برابر رہتی ہیں، اور کبھی شرح پیدائش، شرح اموات کی بہ نسبت مشکل سے ایک فی ہزار زائد ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرزمین فرانس میں غیر قوموں کے مہاجرین کی تعداد روز افزوں ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں فرانس کی ۴ کروڑ ۱۰ لاکھ آبادی میں ۲۸ لاکھ ۹۰ ہزار غیر قوموں کے لوگ تھے۔ یہ صورت حال یونہی جاری رہی تو بیسویں صدی کے اختتام تک فرانسیسی قوم عجب نہیں کہ خود اپنے وطن میں اقلیت بن کر رہ جائے۔

یہ انجام ہے اُن نظریات کا جن کی بنا پر عورتوں کی آزادی اور حقوق نسواں کی تحریک انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھائی گئی تھی۔